اکیسواں سفر ۔ زیارت مکّۂ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ

صفا و مروہ من شعائر اللہ

(یہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں)

سائنس کی ترقیات تیز ہوگئی تھیں۔ کیسیٹ پلیئر اور رنگین ٹیلی ویژن وغیرہ عام ہو گئے تھے۔ ہندوستانی فلمیں سنیما ہال میں بند تھیں، لیکن چند گھروں میں وی سی آر کی وجہ سے ہندوستانی فلمیں دیکھی جانے لگی تھیں۔ یہ مشین ۱۹۷۵ء میں ایجاد ہوئی اور ہمارے گھر پہلی مرتبہ فلپس کا وی سی آر ۱۹۷۶ء میں آ گیا جس کی ایک کیسٹ صرف ایک گھنٹہ چلتی تھی اور ہندوستانی فلم تین کیسٹ پر ملتی تھی۔ پولیس چھاپہ مارتی اور وی سی آر ضبط ہوتے۔ پھر پولیس اسٹیشن جاتے تو وہاں سپاہیوں سے یہ چیزیں تب ملتیں جب وہ سارے خود فلم دیکھ چکے ہوتے۔ کچھ صدقہ، کچھ نذرانہ دیا جاتا انہیں تب کہیں فلم اور مشین واپس ہوتی، اگلے چھاپے تک کے لئے۔

ہم نے نومبر ۱۹۷۵ء میں ہندوستان جانے کا جو ارادہ کیا تھا وہ تو ہمارے شوہر کی وفات کے بعد

ہم نے پورا نہیں کیا۔ فروری ۱۹۷۸ء میں ہم نے پاسپورٹ کی پھر ہندوستان کے لئے ایک سال کی تجدید کروائی، لیکن ہندوستان نہیں جا سکے۔ اِدھر ہم بہت عرصہ سے عمرہ کا سوچ رہے تھے سو بیٹے شمس نے کہا کہ اب دوڑ رامپور کی مسجد کے بجائے بڑی مسجد کی کریں۔ یہ ابھی بھی پی آئی اے میں تھے۔ لہذا خاصی تیاری کے بعد مکّہ، مدینہ، دمشق، لندن، فرینکفرٹ، پھر مکّہ اور کراچی واپسی کا منصوبہ بنا۔ جنرل ضیاء الحق نے فروری ۱۹۷۹ء میں شرعی نظام نافذ کیا تو بچوں اور بچیوں کے اسکول کے لباس ملیشیا کے ہو گئے۔ ہمارا نکلنا ضروری ہو گیا۔

سیاحتِ عظمیٰ: کراچی، جدّہ، مکّہ، مدینہ، دمشق، لندن، فرینکفرٹ، جدّہ، کراچی.....۱۸/دن

پاکستان سے ہم سب کو محبت ہے، لیکن پاکستانی پاسپورٹ سے چند ہی پاکستانی مطمئن ہونگے۔ پاسپورٹ پر جس طرح سے گھسیٹی ہوئی انگریزی میں ہاتھ سے نام لکھتے تھے اور جس قدر گندی اور گھِسی ہوئی مہریں پاکستانی استعمال کرتے تھے، ایسی ہم نے کسی دوسرے ملک میں نہیں دیکھیں۔ پھر ویزے کے لئے ہمیں اس قدر پریشانیاں ہوئیں کہ اللہ کی پناہ۔ ہم نے ۴/فروری ۱۹۷۹ء میں دمشق جانے کے لئے شام کا ویزا لیا تو

اس کی معیاد صرف ایک مہینہ کی دی گئی۔ اس کے بعد ہم نے سعودی عرب کا ویزا لیا تو اس کی معیاد بھی ایک ماہ کی تھی۔ انگلستان جاتے وقت کیونکہ فرینکفرٹ کے ہوائی اڈّے پر رُکنا تھا، لہٰذا جرمنی کا ویزا ہمیں انگلستان کے ویزا سے پہلے لینا پڑا۔ کافی پاکستانی سرمایہ دکھانے کے بعد اور شمس کی پی آئی اے کی ملازمت کی وجہ سے ویزا مل تو گیا، لیکن اب ۶/ مارچ ہوگئی تھی۔ پھر جب ہم ۴۰/ مارک ویزا کی فیس دے ہی رہے تھے تو ہم نے ٹرانزٹ، یعنی راہداری ویزا کے بجائے سیّاحت کا ویزا لیا تاکہ فرینکفرٹ بھی دیکھ لیا جائے۔ پھر ہم نے انگلستان کے ویزا کے لئے درخواست دی تو اس کے ملتے ملتے ۸/ مارچ آ گئی۔ تب تک شام کا ویزا ضائع ہو چکا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ شام کا ویزا ہم جدّہ جا کر دوبارہ لیں گے۔ شامی سفارتخانہ اسلام آباد میں تھا اور ہماری پرواز ۹/ مارچ کی مقرر تھی۔

۹/ مارچ ۱۹۷۹ء کی صبح ۸/ بجے ہم پی آئی اے کی پرواز سے جدّہ پہنچے۔ یہ DC-10 طیارہ تھا، بہت وسیع اور آرام دہ۔ ہم پہلی مرتبہ اتنے بڑے طیارہ میں بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے ہندوستان سے پاکستان آتے وقت ڈکوٹا DC-3 میں آئے تھے۔ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکے کہ نمبر ۳/ اور نمبر ۱۰/ کا فرق تھا۔

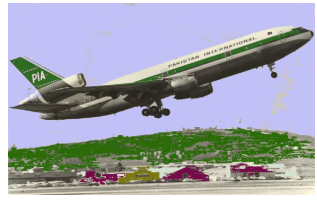

کراچی سے جدّہ: پی آئی اے کے DC-10 طیارے سے ہمارا سفر

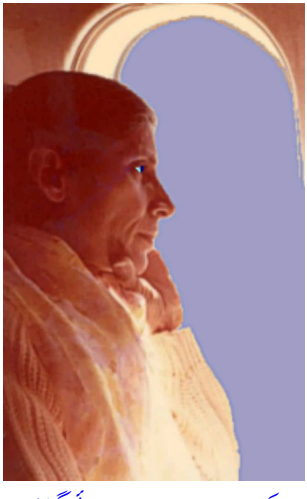

کراچی سے جدّہ: سفر ڈھائی گھنٹے کا

۱۹۷۹ء میں ہوائی جہاز کا سفر ابھی بھی باعزت سمجھا جاتا تھا۔ جہاز کی نشستیں کھلی کھلی ہوتی تھیں اور آج کل کی طرح لوگوں کو ہوائی جہاز میں بھرنے کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ کراچی میں تو اتنی ٹھنڈ نہیں تھی، لیکن پھر بھی سوئٹر وغیرہ پہن لئے تھے۔ سارے راستے کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے کہ دیکھیں کہاں جا رہے ہیں۔ کراچی سے چلے تو مکران کے اوپر، پھر کچھ ایران اور پھر سعودی عرب، پورا علاقہ ریگستانی تھا۔ شمس نے جہاز کے اندر کی کچھ تصویریں لیں، کچھ نیچے کی۔ ڈھائی گھنٹے کی پرواز تھی جس کا پتہ بھی نہیں چلا۔ جدّہ کے ہوائی اڈّے پر کوئی خاص

کسٹم نہیں ہوا، لیکن پاسپورٹ کی سخت جانچ پڑتال کے بعد اُس سے ایک پرچہ لگا دیا گیا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ اقامہ تھا۔ اسے کھو دیں تو جیل کی نظر ہو سکتے تھے۔ ہوائی اڈّے پر دخول کے کسی افسر نے ہمیں یہ بتانے کی زحمت نہیں کی۔ پاسپورٹ کی مہروں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس پر تاریخیں اسلامی تھیں، اور ۹/ مارچ کی جگہ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

ہوائی اڈے سے باہر نکلے۔ مارچ کا شروع تھا اور گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ٹیکسی لی اور منصوبہ یہ بنا کہ اسی دن طواف کیا جائے کیونکہ یہ جمعہ کا دن تھا۔ ہمارے پاس کچھ لوگوں کو دینے کے لئے کچھ اشیاء تھیں، لہذا مناسب یہ بھی تھا کہ ان کو پہلے نکال دیا جائے تاکہ وزن کم ہو۔ جدّہ میں ہمارے ایک عزیز مسعود نقوی اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ مقیم تھے۔ ہم نے ٹیکسی والے کو ان کا پتہ بتایا تو یہ کافی آسان ثابت ہوا۔ راستے میں ہم نے دیکھا کہ ہر جگہ نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں اور سڑکیں امریکہ کی طرز کی تھیں۔ زیادہ آبادی پرانے جدّہ میں تھی۔ یہ دیکھتے دا کھتے جلد ہی مسعود صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ ان کا اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ اوپر گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہم نے دروازے کو ہلکے سے ہلایا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر ہلکے سے آواز دی، ''دلہن، دلہن''، تو مسعود کی بیگم سلمہ صاحبہ اٹھ بیٹھیں۔ پتہ چلا کہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر آئی تھیں اور اسی میں آنکھ لگ گئی۔ کہنے لگیں، ''میں خواب میں آپ کی دلہن دلہن کی آواز سُن کر سوچ رہی تھی کہ یہ کون ہے جو مجھے اس طرح پکار رہا ہے۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے یہ سنتے ہوئے۔ یہاں کان ترس جاتے ہیں اس طرح کے رشتے سننے کے لئے''۔ ہم نے ان کا سامان ان کے حوالے کیا اور جانے کے لئے اُٹھنے لگے۔ یہاں ابھی صبح کے ۱۰/بج رہے تھے کیونکہ پاکستان اور سعودی عرب میں ڈھائی گھنٹے کا فرق تھا۔ جدّہ میں دِن میں ۱/ سے ۴/تک تمام دفاتر اور دکانیں بند ہو جاتی تھیں اور سب گھروں میں جا کر سوتے تھے۔ شام کو ۴/ سے ۸/ بجے تک تمام دکانیں اور دفتر پھر کھل جاتے تھے۔ سلمہ نے ہمیں روکا اور کہا کہ ''مسعود کے آنے کے بعد مکّہ جائیں''۔ کچھ چائے چلی اور اتنے میں ۱/بج گیا تو مسعود آ گئے۔ مسعود نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہمارا ہوٹل میں ٹھہرنے کا منصوبہ بالکل اڑا دیا۔ کہنے لگے کہ ''ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں نہیں رہ سکتیں''۔ پھر یہ سب ہی مکّہ چلنے کو تیار ہو گئے۔ سلمہ اور بچوں سمیت سب نے نہا دھو کر احرام باندھے۔ ہم نے بھی یہی کیا۔ سب مسعود کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ان کی ۹/ سالہ صاحبزادی حنا ہمیں عمرہ اور طواف کے بارے میں سمجھاتی رہیں۔ یہ غالباً بہت عمرے کر چکی تھیں۔ یہ لوگ ۱۳/سال سے جدّہ میں رہتے تھے۔

جدّہ سے مکّہ کے راستے میں میقات، جحفہ کے مقام پر پڑتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ عمرہ کے لئے پہلی ضرورت کے مطابق شمس نے یہاں احرامین کے لئے احرام باندھے اور ہم سب نے دو رکعت نماز پڑھی، اور طلبیہ کے مطابق لبیک کہتے ہوئے مکّہ کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچے تو ماہِ ربیع الثانی کے حساب سے بھی بہت مجمع تھا۔ لوگ حج کے علاوہ بھی سعادت کے لئے آتے تھے۔ کعبہ کے باب الامراء سے ہوتے ہوئے ہم سب حرم میں داخلہ کی دعائیں پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّکَ قُلْتَ فِي کِتَابِکَ .....

حرم کا فرش سنگِ مرمر کا تھا اور بہت ٹھنڈا تھا۔ کہتے ہیں کہ فرش کو مصنوعی طور پر ٹھنڈا رکھنے کے لئے اس کے نیچے نلکیاں پڑی ہیں جس میں ٹھنڈا پانی یا ٹھنڈی ہوا گزار کر اسے گرمیوں کی دوپہر میں بھی ٹھنڈا یخ رکھا جاتا ہے۔ یہاں ہم نے کعبہ کے گرد طواف کیا، پہلے ۳/مرتبہ بہت تیزی سے، اور پھر ۴/مرتبہ صرف پیدل چلتے ہوئے۔ پھر ہم نے سنگِ اسود اور دروازہ کعبہ کے درمیان سینہ مس کیا، سنگ اسود کو بوسہ دیا، اور اس کے بعد مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نمازِ طواف واجب ادا کی۔ کوئی جگہ کچی نہ تھی، سوائے زمزم کے، جس کے گرد بھی کچھ تعمیر جاری تھی۔ یہاں ہم نے آبِ زمزم کو اپنے اوپر چھڑکا اور پیا کہ ایسا کرنے کی تاکید ہے۔ اس کے بعد ہم کعبہ کے بڑے دالان سے ہٹ کر صفّا اور مروہ کی دوڑ کے برآمدے میں آئے۔ یہاں ہم نے صفّا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس وقت یہاں ایسا ہی لگتا تھا کہ سعی کی تمام دوڑ ایک بڑے ایئر کنڈیشنڈ برآمدہ میں کی جارہی ہو۔ سعی کے بعد ہم نے تقصیر کے لئے ناخن اور بال تراشے۔ اسی دوران مغرب وعشاء کی نماز کا وقت ہوگیا تھا سو ہم نے یہ نمازیں بھی ادا کیں۔ اسی دوران شمس نے ایک چھوٹے سے کیمرہ سے اوپری منزل جا کر چند تصویریں لیں جو کیمرہ کو چھپا کر لینا پڑیں اور بالکل ہی خراب آئیں۔ رات گئے گھر واپس آئے۔

دوسرے روز ہم نے جدّہ شہر دیکھا۔ شمس کسی کام سے پی آئی اے کے دفتر بھی گئے۔ یہاں انہوں نے شامی سفارتخانہ کے بارے میں تفصیل حاصل کی اور نشستیں پکّی کروائیں۔ باہر نکل کر مزید شہر دیکھا۔ یہی دیکھا کہ ہر سڑک کھدی ہوئی تھی، جگہ جگہ ۲۰/، ۳۰/منزلہ عمارتیں بن رہی تھیں، اور ہر ایک کے پاس بڑی بڑی امریکی کاریں تھیں۔ پاکستانیوں کے پاس زیادہ تر جاپانی کاریں نظر آئیں۔ ایک جگہ دیکھا کہ پولیس کا ایک شرطہ کسی کار کا چالان لکھ رہا تھا۔ اب تو ہم اس کو ٹریفک ٹکٹ کہنے لگے ہیں، لیکن اس وقت ہم اس کو چالان

ہی کہتے تھے۔

جدّہ میں قدیم جگہیں بہت کم ہی رہ گئی ہیں۔ یورپ کے ہر ملک میں ہم نے یہی دیکھا کہ وہ اپنی ایک ایک اینٹ کو سجا کر رکھتے ہیں اور سیاح ان اینٹوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہاں سعودی عرب میں ایسا نہیں تھا۔ پرانی عمارتیں مسمار ہو رہی تھیں اور نئی عمارات اُن کی جگہ لے رہی تھیں یا نئی سڑکیں کاٹی جا رہی تھیں۔ جدید جدّہ یورپی ممالک اور امریکہ کے شہروں کے مقابلہ کا لگا۔ یہ سب ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ کر دیکھا۔ اور چار گھنٹے میں کافی شہر دیکھ لیا تو واپسی کا ارادہ کیا۔

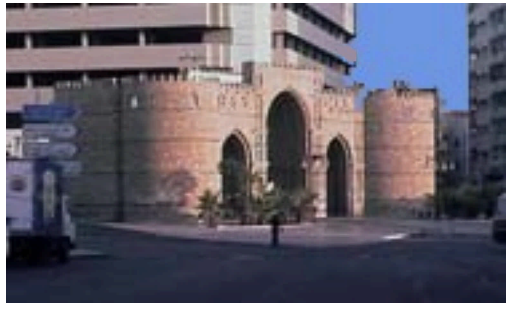

جدہ: قدیم، تورہ درِمکہ

جدّہ: آج، جدید دفاتر کی عمارات

ہم نے واپس گھر آ کر کچھ آرام کیا، اور شام کو صرف شمس اور ہم دوبارہ مکّہ روانہ ہو گئے۔ اسی طرح دوبارہ عمرہ ادا کیا۔ مجمع زیادہ تھا اور لوگ قطار میں لگے تھے سنگِ اسود کو بوسہ دینے کے لئے۔ جو بوسہ دینے میں زیادہ وقت لے اُسے شرطہ صاحب زبردستی گھسیٹ کر الگ کر دیتے تھے۔ گھسیٹنے سے پہلے ایک دفعہ ''یا

اللہ مافی'' کا نعرہ ضرور لگاتے، اور اگر کوئی پھر بھی نہ ہٹے تو اسے یہ لوگ گھسیٹ کر ہٹا دیتے تھے۔ اس میں کبھی جھگڑا بھی ہوتا اور کسی کو دھکّے بھی پڑتے تھے۔ اس مرتبہ کافی دوسری چیزوں پر غور کیا۔ کعبہ کے چاروں طرف دکانیں اور چھوٹی سرائیں تھیں۔ اکثر توڑی جا رہی تھیں اور یہاں لگتا تھا کہ بڑے ہوٹل بنائے جا رہے تھے۔ ہم پھر رات گئے ٹیکسی لے کر واپس جدّہ پہنچے۔ دیکھا تو سب گھر والے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ پروگرام ہمیں تو یوں ہی سے لگے، کیونکہ نہ موسیقی تھی، اور نہ ہی کوئی رنگ۔ نہ اس پر کوئی خاتون نظر آتی تھیں۔

تیسرے روز، ۱۱/ مارچ کے دن ہم نے صبح ہی صبح شام کے سفارتخانہ جا کر دوبارہ ویزا لگوایا۔ پھر جدّہ یونیورسٹی گئے جہاں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی سے ملاقات کی۔ یہ شمس کے ایک دوست کے چچا تھے اور ان کی شمس کی سلام علیک تھی۔ یہ یہاں اسلامی ریسرچ کر رہے تھے۔ اب ہم ان کے ساتھ تیسری بار پھر مکّہ گئے اور ایک اور عمرہ ادا کیا۔ اس رات شمس نے دوبارہ تصویریں لینے کی کوشش کی، لیکن اللہ کی مرضی کہ تصویریں دوبارہ بھی بالکل سادہ آئیں۔ شمس رشتہ داروں کی ہر شادی کی تقریب کے فوٹو گرافر ہوتے تھے، اور اُن سے تصویریں کبھی خراب نہیں ہوتی تھیں، لیکن یہاں نہ جانے کیا ہوا تھا کہ کعبہ کے اندر کوئی تصویر نہیں کھینچی جا سکی۔ اس کے بعد ہم سارا دن وہیں رُکے اور نمازیں پڑھتے رہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس عمرہ اور حج کے بعد تمام فرائض سے آزاد ہو گئے۔ لیکن فرائض زندگی کے ساتھ ہیں۔ انسان کو انسان سمجھنا، ہمدردی کرنا اور دوسرے کی دلجوئی کرنا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ دل چاہتا تھا کہ وہاں مزید رکیں لیکن وقت اور ویزے کی مجبوری تھی۔

مدینہ منوّرہ کا سفر

اس دن شام کو ہم نے مکّہ ہی سے مدینہ منوّرہ کے لئے ٹیکسی لی۔ اس ٹیکسی میں ۴/ مسافر تھے۔ مدینہ کی شاہراہ انتہائی ہموار اور آرامدہ تھی اور ہر تھوڑی دور آرام کے لئے جگہیں اور ریستوراں تھے۔ راستے میں ہم اس زمانے کے حالات کو سوچتے رہے جب سفر اونٹوں پر ہوتا تھا، اور گرمی، ریگستان میں ناہموار راستہ، نہ پانی میسّر اور نہ رات میں روشنی۔ ٹیکسی ڈرائیور کوئی عربی تھا۔ کہیں اُس نے رک کر پٹرول ڈلوایا۔ یہاں اسے بنزین کہتے تھے۔ ہم نے پینے کے پانی کی بوتل خریدی تو پانی اس بنزین سے مہنگا نکلا۔ راستے بھر ہم نے سڑک کے کنارے حادثوں میں تباہ شدہ گاڑیاں الٹی پڑی دیکھیں۔ یہاں شاید عبرت کے لئے یہ کاریں سڑک کے کنارے چھوڑ دیتے تھے۔ ٹیکسی کی رفتار کے آلہ کی سوئی کبھی ۱۰۰/ کلومیٹر فی گھنٹہ پر ہو تو کبھی ۱۱۰/ پر۔ آخر ہم

سے نہ رہا گیا اور ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ آہستہ چلائے۔ یہ نہ پوچھیں کہ کیسے کہا ہوگا۔ ڈرائیور نے رفتار آہستہ کی اور چند منٹ بعد دوبارہ اسی رفتار پر آ گیا۔ اس ڈرائیور نے سارے راستے گانوں کی ایک کیسیٹ لگائے رکھی، اور اس میں تمام گانے ایک ہی سُر میں تھے اور ہر نغمہ میں ''یا حبیبی'' کی تال ضرور تھی۔ رات ۸/ بجے کے قریب ڈرائیور نے ٹیکسی ایک جگہ روکی۔ یہ کوئی اچھا ریستوراں نہیں تھا بلکہ ایک جھگی نما ہوٹل تھا۔ سب ہی لوگ گئے۔ شمس نے معلوم کیا تو یہاں صرف مچھلی اور چاول تھے۔ ہم نے یہ کھانے سے انکار کر دیا اور صرف پانی پر گزارا کیا۔ یہاں حوائجِ ضروری کے لئے صرف ریگستان تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور دوسرے مسافر وہیں فارغ ہو کر آ گئے، اور ٹیکسی پھر چل پڑی، اور پھر وہی ''یا حبیبی'' کے گانے شروع ہو گئے۔ ہم نے کشمش، چنے، مونگ پھلی اور ناریل کا چینہ اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا اور کچھ چائے بھی تھی۔ اسی پر گزارا کیا۔ رات ساڑھے دس بجے مدینہ منوّرہ کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ کچھ اور وقت ہوٹل کی تلاش میں لگا اور ٹیکسی کے اڈّہ کے قریب ہی ایک ہوٹل مل گیا۔ سوتے سوتے رات کے تین بج گئے۔ ہمیں صبح ۶/ بجے نکلنا تھا کیونکہ یہاں بی بی فاطمہؑ کے گھر کی زیارت صبح کو کروائی جاتی تھی۔ یعنی ہم نے تین گھنٹے سونے کے لئے ڈیڑھ سو ریال دیئے۔ مدینہ میں ہمارے پاس صرف ایک دن تھا۔ دوسری شام جدّہ پہنچنا تھا۔ پھر بھی خدا کا شکر ادا کیا اور سو گئے۔

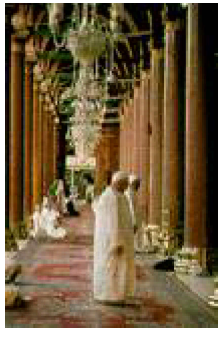

مسجدِ نبوی: اندرونی حصہ۔ محراب، ستون، فانوس اور اعلیٰ قالین

تین گھنٹے کی نیند کے بعد اٹھنا مشکل، لیکن جذبے میں برا نہیں لگا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور مسجدِ نبوی میں آئے اور بی بی زہرہؑ کے حجرے کی جالی سے زیارت کی۔ یہیں آپؑ کی قبر ہے۔ اندر آپؑ کی چکّی بھی دوسری چند چیزوں کے ساتھ نظر آئی۔ درِ جبرئیل سے داخل ہو کر اندر آنا ہوتا تھا۔ پھر حضورؐ کے روضہ پر گئے۔ اس سے لپٹ گئے اور ہماری آنکھیں نظرانہ پیش کرنے لگیں۔ ہم دعا مانگ رہے تھے کہ ایک برقعہ پوش خاتون

آئیں اور ہمارا بازو دبا کر ہمیں متوجہ کر کے کہنے لگیں، ''غلط کھڑی ہو''۔ ہم پریشان کہ کیا غلطی ہوگئی۔ وہ کون تھیں، یہ نہیں معلوم۔ بس سیاہ برقع، دراز قد، نقاب رُخ پر تھی۔ لیکن وہ فوراً وہاں سے چلی گئیں اور دوبارہ نظر نہ آئیں۔ ہم دوبارہ روضے کو پکڑ کر دعا مانگ رہے تھے کہ اب ایک شرطی نے آکر ہمیں بازو سے ہٹایا اور ''بدعت، بدعت'' کی آوازیں نکالنے لگی۔ یہ مذہب کی پولیس بھی خوب ہے۔ ایسے مقامات پر کیا حالت ہوتی ہے یہ وہ ہی جان سکتے ہیں جو وہاں جا چکے ہوں یا جانے کی تمنا رکھتے ہوں۔ ہم اسی عالم میں تھے۔ اب یہ شرطی ہمیں ہٹا کر خود روضہ کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہوگئی۔ ہم نے اسے اشارے سے کہا کہ یہ بھی بدعت ہے جو وہ کر رہی ہے، تو وہ ہٹ گئی۔ ہم پھر حضورؐ کے قدموں میں جھک گئے اور سوچتے رہے کہ ''حضورؐ، آپ تک پہنچنا کتنا مشکل بنا دیا ہے اِن لوگوں نے۔ اپنے مطلب اور غرض کے لئے تقسیم کر دیا ہے آپؐ کی امّت کو۔ ہم لوگ کتنی دور سے اور کتنی لگن سے یہاں آتے ہیں اور ان بدوؤں کی بے رُخی اور بدتہذیبیوں سے الجھنا پڑتا ہے جیسے کہ یہ صرف منتظم نہیں، بلکہ مالک ہوں''۔ یہاں ہم موم بتیاں اور اگربتیاں بھی نہیں جلا سکے جو ہم پاکستان سے صرف اسی مقصد کے لئے لائے تھے۔ تمام دنیا کے گرجوں میں شمعیں جلانے کی جگہیں ہوتی ہیں لیکن یہاں ہر چیز ممنوع تھی۔

بی بی زہراؑ کے حجرے کے پاس صحنِ حضرت علیؑ تھا۔ ہم نے وہاں رک کر مزید دو رکعت نماز پڑھی۔ ۱۴ ستون پر سب سنّت نمازیں ادا کیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی قبریں بھی یہیں دیکھیں۔ باہر آکر ہم نے اپنے بیٹے کے پوچھنے پر برقعہ پوش خاتون اور شرطی کا سارا واقعہ سنایا۔ دوپہر ہو چلی تھی۔ ہمیں اسی دن واپس لوٹنا تھا۔ ہم نے دعا کی کہ ''حضورؐ پھر آنے کا موقعہ ملے''، اور سلام کر کے رخصت ہوئے۔ یہاں سے نکل کر ہم جنت البقیع کی طرف چلے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کی توسیع ہو رہی تھی اور ہم اندر نہیں جا سکتے تھے۔ چاروں طرف لوہے کا جنگلہ لگایا جا رہا تھا، بہت بعد میں خبر ہوئی کہ یہاں کی مسجد گرا دی گئی تھی۔ یہاں رسول کریمؐ کی زوجۂ کریمہؑ اور آپؐ کے صاحبزادے جناب ابراہیمؑ مدفون ہیں۔ حضرت امام حسنؑ، امام زین العابدینؑ، امام محمد الباقرؑ، اور امام جعفر الصادقؑ بھی یہیں دفن ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں تقریباً ایک ہزار صحابۂ رسولِ پاکؐ بھی مدفون ہیں۔ یہاں جانے کے لئے عورتوں کے الگ دن تھے اور یہ دن عورتوں کا نہیں تھا۔ شمس اندر گئے اور انہوں نے دعا مانگی، باہر آگئے۔ برابر ہی ایک ہوٹل تھا، فندق ظہور۔ اس کی سب سے اوپری چھت پر سے جنت البقیع پورا نظر آتا تھا، وہاں گئے اور دیکھا۔ یہاں سے شمس نے تصویریں بھی لیں جو ہماری

کتاب تکمیلِ وفا میں چھپ چکی ہیں۔ ہم ہاتھ باندھے کھڑے رہے، اور یہیں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد ہم سادات کی پرانی بستیوں کی تلاش میں نکلے۔ جنت البقیع کے سامنے ایک بازار تھا، اسی طرح جیسے پاکستان اور ہندوستان میں ہر مقبرہ اور مقدس جگہ کہ آس پاس ہوتے ہیں۔ اس وقت اس بازار کے اندر سے ایک راستہ ایک نشیب میں جاتا تھا۔ ہم اس راستے پر گئے تو یہ راستہ ہمیں پتلی گلیوں میں لے گیا۔ ان گلیوں میں اوپر سیاہ رنگ کے پہاڑی تودے سایہ کئے ہوئے تھے۔ یہاں گھر تہہ خانوں کی طرح تھے۔ ہم نے گزرتے ہوئے ایک دو گھروں میں دیکھا تو یہ کشادہ لیکن خستہ حال گھر تھے۔ معلوم ہوا کہ ان پرانی بستیوں کو گرا کر مسجدِ نبوی کا احاطہ بڑا کیا جا رہا تھا اور ایک سڑک بنائی جا رہی تھیں۔ افسوس ہوا کہ دوسری قومیں اپنی پرانی اینٹ تک کو چھونے بھی نہیں دیتیں اور یہ اپنی تاریخ کو اس طرح بل ڈوزر سے کونے میں لگا رہے تھے۔

مدینہ منوّرہ : ایک پرانی طرز کا بازار۔ یہاں سے جائے نماز، تسبیح اور سجدگاہ جیسی اشیاء مل جاتی ہیں۔

مدینہ منوّرہ میں پاکستانیوں کے کئی ریستوران تھے۔ ایک ریستوراں جو مسجد کے سبز گنبد کے بالکل پیچھے تھا، ہمیں اچھا لگا، سو وہیں کھانا کھایا۔ یہاں دوپہر کے کھانے پر پائے اور نان پکے تھے، یہی کھائے۔ صفائی اور پیش کرنے کا انداز بالکل پاکستانی تھا۔ یہ لگا کہ ہم لاہور کے لوہاری دروازے پر کھا رہے ہوں۔ پائے کھانا شروع کئے۔ ایک بوٹی کو دبانا چاہا تو وہ اتنی سخت کے دبانے سے پھسلی اور قریب ایک خاتون کی گود میں گری۔ انہوں نے ہنس کے کہا کہ ''اب تو یہ بوٹی ہماری ہوگئی، آپ دوسری کھائیے''۔ ہم نے بوٹیاں چھوڑ

کر صرف شوربے سے روٹی کھائی۔ کچھ تصویریں، تبرّکات اور تسبیحیں خریدیں۔ آس پاس کا شہر دیکھا، اور پھر ٹیکسی کے لئے چلے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر شمس نے ہماری تصویر لینے کی کوشش کی تو ایک شرطے صاحب پھر موجود اور تصویر لینے کو ''ممنوع، ممنوع'' کا نعرہ مار کے روکنے لگے۔ اس پر شمس نے اُس کو غصّہ میں جھڑکا اور وہ تصاویر دکھائیں جو ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے خریدی تھیں۔ پھر انہوں نے اس کے سامنے ہی ہماری ایک تصویر لی جس میں پیچھے مسجدِ نبوی نظر آتی تھی۔ شرطہ کچھ نہ بولا۔ اگر ہمیں سعودی قانون دس فیصد بھی سمجھ میں آ جائیں تو ہم اِن لوگوں کو معاف کر دیں۔ یہ تصویر بھی ہماری کتاب تکمیلِ وفا میں شائع ہو چکی ہے۔

بعد ازاں ہم ٹیکسی لے کر جدّہ روانہ ہو گئے۔ سارے راستے یہی سوچتے رہے کہ یہ کیوں منع کرتے ہیں روضہ کے قریب آنے سے۔ جدّہ پہنچ کر ہم نے یہ سوال مسعود سے کیا تو انہوں نے کہا، ''ارے کیا پوچھتی ہیں۔ لوگ دانتوں سے سونا کاٹ کر لے جاتے ہیں، خانۂ کعبہ کے غلاف کو چومتے چومتے دانتوں سے کُتر لیتے ہیں تبرّک سمجھ کر یا برکت کے لئے۔ اس لئے زیادہ سختی ہونے لگی ہے''۔ ہم نے بھی سوچا کہ واقعی یہاں دیہاتوں اور شہروں کے، پڑھے لکھے اور نابلد، سب ہی طرح کے لوگ آتے ہوں گے۔ ہر حقیقت تلخ نہیں ہوتی۔ شرطے سب ہی باتیں غلط نہیں کرتے تھے۔ ہم نے مسعود کو مدینہ کے ہوٹل کے کرایہ کے بارے میں بتا کر پوچھا کہ حج کے زمانے میں کیا ہوتا ہے، تو وہ کہنے لگے، ''مت پوچھیں۔ ذرا سی جگہ کا اس قدر کرایہ ہوتا ہے۔ کوئی گلی کوچہ، کوئی پہاڑی اور احاطہ نہیں بچتا جہاں حاجی نہ ہوتے ہوں۔ وہ وقت یہاں کے لوگوں کے لئے چاندی سونا ہوتا ہے۔ پورے ایک سال کا خرچہ یہ لوگ حج پر نکال لیتے ہیں۔ آپ حج پر آئیں تو دیکھئے گا''۔ ہم نے آمین کہا اور بتایا کہ دوسرے دن ہماری دمشق کی پرواز تھی۔ مسعود نے ہمیں دعوت دی کہ ''آپ لندن اور فرینکفرٹ سے واپسی پر دوبارہ ایک دن کے لئے رکیں اور عمرہ کریں''۔ نیکی اور پوچھ پوچھ؟ ہم نے انہیں بتا دیا کہ ''ہم نے ٹکٹ ایسے ہی بنوائے ہیں''۔